eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210

CC BY
OPEN ACCESS

طیبہ ولایت خان
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد
ڈاکٹر رخسانہ بلوچ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

Tayaba Waliyat Khan
Ph.D Scholar, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad
Dr. Rukhsana Bibi **Email:** rukhasanabaloch@gcwuf.edu.pk
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad

اٹھارہویں صدی کی مشترکہ وراثت

The Common Heritage of the Eighteenth Century

DOI: https://doi.org/10.56276/tasdiq.v4i01.98
Received: 10-May-22; **Accepted**:15-June-22; **Online**:30-Jun-22

ABSTRACT

Urdu is an ancient Aryan language associated with Sanskrit. Its history in India dates back to about 1500 years ago. The form came into being which met the standard of literature. This is how the evolutionary journey of Urdu began early specimens of Urdu are found in northern India Amir Khosrow has tried his hand at all genres of prose. Urdu language words are often found together. That is why all Urdu and Hindi people recognize him as their poet. He used common sense language in his speech which was very clear language. Therefore it is appropriate that Amir Khosrow has accepted the influence of Punjabi, a Steep, dialect. The great heritage of Urdu is also found in Deccan who worked for the promotion & publication of this language. Therefore, the early impressions of Urdu are ancient. Among the earliest works of prose are Khawaja Ashraf Jahangir's Magazine and Khawaja Banda Nawaz Gesu Daraz's Miraj-e-Aashiqeen. The most important work of the century is Sub Ras. Another name of this book is Qissa Husan-o-Adal. The Urdu language is slowly developing.

Keywords: Aryan Language, Sanskrit, India, Standard of Literature, Amir Khosrow, Persian, Steep, Dialect, Publication, Promotion.

کلیدی الفاظ: آریائی زبان، سنسکرت، انڈیا، ادب کے معیارات، امیر خسرو، فارسی، بولی، اشاعت، تشہیر

اُردو کا رشتہ قدیم آریائی زبان سنسکرت سے منسلک ہے اس کی تاریخ ہندوستان میں کم و بیش ۱۵۰۰ قبل ہے۔ قدیم ہندوی زبانوں کے ملاپ سے وجود میں آئی اس میں ہر زبان کے الفاظ ملتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ اس کی ایک نئی شکل وجود میں آئی جو ادب کے معیار پر پورا اترتی ہے۔ اسی طرح اُردو کے ارتقائی سفر کا آغاز ہوا۔ شمالی ہند میں اُردو کے ابتدائی نمونے ملتے

ہیں۔ اسی طرح امیر خسرو نے تمام اصناف نثر میں طبع آزمائی کی ہے۔ فارسی، ہندی اور عربی تینوں زبانوں میں دیوان موجود ہیں لیکن ان کے کلام میں ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کو اُردو اور ہندی والے تمام ہی اپنا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ میں عام فہم زبان استعمال کی ہے جو انتہائی صاف ستھری زبان تھی۔ اس لیے یہ بات مناسب ہے کہ امیر خسرو نے فارسی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا اثر قبول کیا ہے۔ اُردو کی شاندار وراثت دکن میں بھی ملتی ہے۔ جہاں تغلق نے اس زبان کی ترویج واشاعت کے لیے کام کیا۔ اس لیے اُردو کے ابتدائی نقوش قدیم ہیں۔ جہانگیر کا رسالہ اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین قابلِ ذکر ہیں اس کے بعد پندرھویں صدی میں بھی چند اُردو کی تصانیف سامنے آئیں۔ سولھویں صدی میں برہان الدین جانم کی تصنیف ہے۔ سترھویں صدی کی سب سے اہم تصنیف سب رس ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نام قصہ حسن ودل ہے۔ اُردو زبان دھیرے دھیرے ترقی کی منازل طے کرتی جائے گی۔

اردو کی تاریخ قدیم ہے۔ اس کا رشتہ قدیم آریائی زبان سنسکرت سے ہے جس کی تاریخ ۱۵۰۰ قبل مسیح آریہ قوم کے ہندوستان آنے کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ ان دونوں زبانوں کا تعلق قدرے گہرا ہے۔ شاید ماں بیٹی کا رشتہ ہوا ہے۔ سنسکرت قدیم زبان ہے جو کہ قدیم ہندوستان میں رہنے والوں کی زبان تھی جبکہ اُردو اس کے بعد میں وجود میں آئی جس میں اس زبان کے کافی الفاظ موجود ہیں۔ ان دونوں زبانوں کے درمیان کا فاصلہ کافی زیادہ ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار کا فاصلہ ہونے کے باوجود دونوں کا ایک ہی ماخذ ہے۔ سنسکرت زبان کا ارتقا کا تعلق آریائی خاندان سے ہے۔ دھیرے دھیرے یہ زبان آگے چل کر دو مختلف شکلیں اختیار کر گئی جن میں ایک ویدک سنسکرت اور دوسری کلاسیکی سنسکرت ہے۔ اس بارے میں مرزا خلیل احمد بیگ یوں بیان کرتے ہیں:

> "۱۵۰۰ قبل مسیح سے جب آریائی نسل کے لوگ ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں وارد ہوئے تو یہاں ایک نئی تہذیب پروان چڑھی جس نے جلد ہی سنسکرت جیسی صاف ستھری اور شائستہ زبان کو جنم دیا پھر ڈھائی ہزار سال کی تہذیبی کروٹوں اور لسانی تبدیلیوں کے بعد اس خطہ ارض میں اُردو پیدا ہوئی۔ لہٰذا اُردو کی جڑیں ہندوستان میں اتنی ہی گہری ہیں جتنی کہ دوسری جدید آریائی زبان کی۔ سنسکرت کے ارتقا اور فروغ کا زمانہ قدیم آریائی عہد کہلاتا ہے۔ جو ۱۵۰۰ق م سے لے کر ۵۰۰ ق م تک قائم رہتا ہے۔ اس طرح اس کی دو شکلیں وجود میں آئی۔ جنہیں ویدک سنسکرت اور کلاسیکی کہتے ہیں۔"(۱)

ویدک سنسکرت ویدوں کی زبان ہے جبکہ کلاسیکی سنسکرت میں اعلیٰ معیاری ادب تخلیق ہوا۔ قدیم آریائی دور کی تصانیف میں ایک نہایت اہم کتاب اشٹ ادھیائی ہے جو کہ ایک سنسکرت عالم پانن کی تصنیف ہے اس کتاب کا موضوع قواعد ہے۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی کتاب ہے۔ اس زبان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اندر لچک کی گنجائش نہیں رکھی جس کی وجہ سے یہ آگے چل کر زوال کا سبب بنی۔ اس عہد تک آریاؤں نے ہندوستان کے شمال سے مغرب تک پھیل کر ایک سلجھے معاشرے کی شکل اختیار کر لی۔ دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان کا اثر کم ہو گیا رفتہ رفتہ یہ زبان ختم ہوتی گئی۔ اس زبان کے زوال کا سبب عوام سے دور رکھنے کی کوشش اور اس زبان میں کسی طرح کی تبدیلی کو گناہ قرار دینے کا

رویہ رہا۔ چنانچہ اس کی جگہ پراکرتوں نے لے لی۔ حافظ محمود شیرانی سنسکرت کے زوال کے اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی، علمی و درباری اور ادبی زبان تھی۔ برہمن راجاؤں کے دربار میں حاوی تھے اور مذہب و علوم انھیں کی حفاظت میں تھے۔ درباروں میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا گزر تھا۔ عوام الناس میں تعلیم عام نہیں تھی اور نہ اس دیوبانی زبان کی تحصیل کی ان کو اجازت تھی۔ وہ صرف برہمنوں کی میراث تھی۔"(۲)

اسی طرح جب مغربی ہندی کی مختلف بولیوں میں سے کھڑی بولی نے اُردو کے لیے ہموار راہ کی۔ کیونکہ اُردو کا تعلق براہِ راست اسی کھڑی بولی سے ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اُردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے تو غلط نہ ہو گا۔

> "کھڑی بولی کا اُردو کے ساتھ ماں بیٹی کا رشتہ ہے اور کھڑی بولی شورینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی ہے۔ لہٰذا اس رشتے کی وجہ سے اُردو ایک ہند آریائی زبان قرار پائی ہے۔ کھڑی بولی کا براہِ راست تعلق شعور سغی اپ بھرنش یا مغربی اپ بھرنش سے ہے۔"(۳)

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ محمد بن قاسم سے بھی بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس بارے میں پروفیسر آرنلڈ کا خیال ہے کہ آٹھویں صدی میں عراق اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے کچھ تاجر مسلمان ہندوستان آئے تھے اور یہاں آکر جنوبی ساحلوں میں آباد ہوئے تھے۔ اس طرح اسلام کا اثر بہت جلد پھیلنے لگا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد ہندوستان میں پے در پے حملوں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے ہندوستان کے علاوہ پنجاب پر بھی حملے کیے۔ ان حملوں کے بعد مسلمان پورے پنجاب میں پھیل گئے اور یہ لوگ اپنے ساتھ فارسی اور ترکی لے کر آئے تھے۔ مسلمانوں نے پنجاب میں تقریباً دو سو سالوں تک حکومت کی اور اسی درمیان انھوں نے پنجاب کی عوام کے ساتھ گہرا تعلق قائم کر لیا تھا۔ اسی لیے حافظ محمود شیرانی نے اُردو کو پنجاب کی پیداوار کہا ہے۔

پنجاب کو فتح کرنے کے بعد محمود غزنوی نے لاہور میں اپنا قیام کیا۔ لاہور میں مشہور شاعر سعد سلمان نے ہندوی زبان میں ایک دیوان مرتب کیا لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری نے ۱۱۹۳ء میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر دہلی اور اجمیر پر قبضہ کیا جس کے بعد ہی اُردو نے جنم لیا اور اسی زمانے میں ہندوستان میں مختلف قسم کی زبانیں بولی جاتی تھیں جن میں عربی، فارسی، ترکی اور دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جانے والی بولیاں ہریانی، کھڑی بولی، برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ ان سب بولیوں کے بولنے سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو بعد میں اُردو کہلائی۔

سعد سلمان کے بعد اُردو کے ابتدائی نمونے خواجہ فرید الدین مسعود کے یہاں ملتے ہیں۔ جن کو ڈاکٹر گیان چند نے تاریخ ادب اُردو میں بیان کیا ہے۔ یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شمالی ہند میں اُردو کی ابتدا میں صوفیائے کرام کا بڑا اہم کردار رہا ہے حالانکہ شمالی ہند میں قدیم اُردو کے نمونوں کی کمی ہے لیکن صوفیا کے ملفوظات اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیتے ہیں۔

شمالی ہند میں اُردو کے ابتدائی نمونے مکمل طور پر امیر خسرو ۱۳۲۵ء سے ۱۳۳۵ء تک کے ہیں۔ امیر خسرو نے تقریباً تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے فارسی، ہندی اور عربی تینوں زبانوں کے دیوان موجود ہیں اور ان کے کلام میں

ہندی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ اس لیے ان کو ہندی اور اُردو والے تمام ہی اپنا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے پہیلیاں کہہ مکرنیاں وغیرہ روزمرہ کی عام فہم زبان میں بیان کی ہیں کیونکہ اس دور میں اتنی صاف ستھری زبان کا تصور محال تھا جس قدر امیر خسرو نے اپنی شاعری اور دوسری اصناف میں استعمال کی ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ امیر خسرو نے فارسی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا اثر قبول کیا ہے۔ اس کے بعد کھڑی بولی پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اس کے لیے گوپی چند نارنگ یوں بیان کرتے ہیں۔

> "یہی وہ زبان تھی جسے بھگتوں صوفیوں اور جوگیوں نے اپنے نمونہ کلام میں استعمال کیا کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس کے ذریعے عوام کے دلوں تک پہنچا جا سکتا تھا بھگتوں نے تو اپنے علاقے کی وجہ سے برج بھاشا کا سہارا لیا اور بھگتوں نے ہندی اور اُردو کو اپنے کلام میں شامل کیا۔"(۴)

اُردو کے ارتقائی سفر میں جہاں مسلمان صوفیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا وہیں سادھوں اور بھگتوں نے بھی اس میں قابل ذکر کام کیا۔ اس میں سوامی نامی دیو بھکتی تحریک سے وابستہ مراٹھی شاعر تھے جنہوں نے اپنا پیغام عام انسانوں تک پہنچانے کے لیے مراٹھی اور کھڑی بولی میں شاعری کی۔ دھیرے دھیرے یہ تمام بولیاں اُردو زبان میں ڈھلتی گئی۔ اور ایک شائستہ زبان وجود میں آئی۔

صوفیوں اور شاعروں نے ہی مل کر اُردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے جو ہندوستان میں رہنے والی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوش گوار ماحول کو تعمیر کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔

سترھویں صدی کے اوائل میں محمد افضل کی بکٹ کہانی کا ایک نمونہ ملتا ہے جسے پروفیسر مسعود نے شمالی ہند کی اُردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ قرار دیا ہے۔ بکٹ کہانی کو بارہ ماسہ بھی کہتے ہیں۔ اس میں فارسی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا کی بھی آمیزش ہے۔ یہ ادبی اور لسانی اعتبار سے اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ اس کی زبان کھڑی بولی ہے لیکن اس کے میں فارسی اور برج بھاشا کا بھی گہرا اثر ملتا ہے۔ اسی صدی کے اواخر میں شمالی ہندوستان کی ایک اور تصنیف "عاشور نامہ" ہے یہ طویل مثنوی ہے۔ انھیں مصنف روشن علی نے لکھا ہے اور یہ واقعہ کربلا کی یاد میں لکھی گئی۔

شمالی ہندوستان میں جہاں ابتدائی دور کی مشترکہ تہذیب دکھائی دیتی ہے وہیں دکن میں بھی اس کی شاندار وراثت دیکھی جا سکتی ہے۔ جب علاء الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا تو اس کی باقاعدہ شروعات اس وقت ہوئی جب محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنایا یہ تخت قرار دیا اس کا یہ فیصلہ بھلے ہی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا لیکن زبان کی ترویج و اشاعت کے اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس حکومت کی تبدیلی کے حکم کے ساتھ دہلی کے وہ تمام باشندے جن کا کسی کے بھی تعلق ہو سکتا تھا۔ ان میں سیاسی اشخاص کے ساتھ ساتھ اہل علم فن کار شعرا وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس کے ساتھ آئے اکثر اہل علم و دانش ور، اولیاء و صوفیا کرام اور متعدد دوسرے لوگ منتقل طور پر یہیں سکونت پذیر ہو گئے اور لوگوں نے اپنی گفتگو کی زبان رکھی جو شمالی ہندوستان میں ہو اکرتی تھی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ایک صوفی بزرگ تھے جو بہمنی سلطنت کے آٹھویں بادشاہ فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں گلبرگہ آئے۔ بہمنی دور کی سب سے مشہور بلکہ اُردو کی سب سے قدیم اور اہم تصنیف مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔

اُردو نثر کے ابتدائی نمونے سترھیوں صدی عیسوی کے اوائل میں ملتے ہیں۔ اُردو کا باقاعدہ تصنیفی دور تو امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اٹھارہویں صدی عیسوی سے اُردو کی کوئی تصنیف نہیں تھی۔ لیکن بارھویں صدی سے قبل شمالی ہند میں کوئی نثر کتاب وجود میں نہیں آئی۔ اس سے پہلے دکن میں اُردو نثر کا آغاز ہو چکا تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلم المتوفی ۱۳۹۲ء کا رسالہ اور خواہ بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ (معراج العاشقین) نشاط العشق کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد خواجہ سید اشرف جہانگیر سخلانی ۱۳۰۸ء میں اخلاق و تصوف پر رسالہ تصنیف ہو چکا تھا۔ اس لیے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا رسالہ ۱۳۹۸ء کا ہے۔ جو سید اشرف جہانگیر کے رسالے سے نوے سال بعد کی تصنیف ہے۔ اُردو میں باقاعدہ تصنیف یہی ہے۔

حضرت امیر خسرو کی خالق باری یا افضل حق کی مثنوی با اشرف جہانگیر کا رسالہ اخلاق و تصوف پر ہو یہ تمام ادبی درجہ رکھتی ہیں۔ شہنشاہ محمد تغلق کے عہد میں حسن بہمنی نے ۱۳۴۷ء میں سلطنت بہمنیہ کی بنیاد رکھ کر اُردو زبان و ادب کو فروغ دیا۔

"اگر ہم اُردو کا سب سے پہلا محسن اعظم حسن بہمنی کو کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔"(۵)

دکنی دور میں سب سے پہلے مصنف شیخ عین الدین گنج العلم کو کہا جاتا ہے۔ فارسی اور اُردو کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس دور میں مسائل شرعیہ کے چند رسالے بھی نکالے تھے۔ اگر ہم اُردو نثر کی سب سے قدیم کتاب جو اشاعت کے مرحلے سے گزر چکی ہے تو وہ حضرت بندہ نواز کی معراج العاشقین ہے۔ جس میں تصوف پر لکھا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے دو رسالے "معراج نامہ" اور "سہ پارہ" بھی ہیں۔ یہ اُردو نثر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، جو آگے چل کر اُردو کی نثر کے ارتقا کی بنیاد بنے۔ اس بات سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوفیا کرام نے اُردو کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔

شیخ بلخ العلم اور گیسو دراز دونوں دہلی کے رہنے والے تھے اور جن پر اُردو کے ابتدائی نثر نگاروں پر اہلِ دکن کو بے حد ناز تھا۔ دکن میں اُردو دہلی سے پہنچی تھی مگر بے حد ثقیل اور ناقابل فہم ہو گی جو شمالی ہند کی اُردو سے ہٹ کر تھی۔ شمالی ہند میں تو بھاشا اور فارسی کے اختلاط سے وجود میں آئی۔ نثر کی اوّلین تصنیف میں خواجہ اشرف جہانگیر کا رسالہ اور حضرت گیسو دراز کی معراج العاشقین ہی قابل ذکر ہیں، ہی ابتدائی تصانیف ہیں۔ اس کے بعد پندرھویں صدی میں بھی چند اُردو کی تصانیف سامنے آئی۔

جن میں شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، گل جاس ہیں۔ ان کے مصنف شمس العشاق شاہ میراں جی ہیں یہ دکن کی سرزمین کے پہلے مصنف تھے۔ جن کی تمام تصانیف پندرھویں صدی کی ہیں۔ اس کے بعد سولھویں صدی میں اُردو ادب کی کتب لکھی گئی لیکن ان میں صرف ایک ہی کتاب کا تذکرہ ملتا ہے جو کلمۃ الحقائق ہے جو برہان الدین جانم کی تصنیف ہے۔

سولھویں صدی میں حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری گزرے۔ اس زمانے میں حضرت شیخ وجیہہ الدین علوی گزرے ان کے مریدین نے ان کے ملفوظات کو "بحر الحقائق" کے نام سے جمع کیا اور جس میں انھوں نے ہندی زبان (میں جواب دیے) کا استعمال کیا ہے۔ اس کے بعد سترھویں صدی میں بھی کچھ نثری تصانیف مل جاتی ہیں۔ جن میں گنج مخفی، شرح تمہید ہمدانی، احکام الصلوٰۃ، سب رس، شمائل القشاء ہے۔

سترھویں صدی کی سب سے اہم تصنیف ملا وجہی کی "سب رس" ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نام "قصہ حسن و دل" ہے۔ یہ دکن کی قدیم اُردو کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کا ادبی مقام اب تک اُردو میں ہے۔ یہ اُردو تاریخ میں بھی اہم حیثیت رکھتی ہے۔

یہ قصہ سب سے پہلے محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری نے ۱۴۸۸ء میں فارسی زبان میں لکھا تھا۔ اس کا نام دستور عشق تھا اور اسے مختصر فارسی زبان میں لکھا گیا۔ ملا وجہی کو دستور عشق تو نہ ملی لیکن قصہ "حسن و دل" مل گیا۔ اس میں انھوں نے ادنی سا تصرف کر کے اسے اُردو میں لکھ دیا۔ اور پھر انہوں نے "سب رس" میں بھی ایسی ہی اُردو لکھی۔

اٹھارھویں صدی میں بھی اُردو نثر کی تاریخ میں اہم ہے۔ اس میں اہلِ قلم کے اُردو کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں جو کہ فضلی کی ۱۷۳۱ء سے شروع ہو کر عطا حسین کی تو طرزِ مرصع تک کے ہیں۔ اسی زمانے میں یورپی مصنّفین نے بھی اُردو کی ترقی کے لیے کوشش شروع کر دیں اور اُردو زبان کی صرف و نحو کو یورپین انداز سے مرتب کر کے ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اٹھارھویں صدی کا پہلا نثری کارنامہ شیخ محمود کی فارسی تصنیف "معرفت السلوک" کا اُردو ترجمہ ہے، اسی زمانے میں فارسی کتاب "طوطی نامہ" بھی ملتی ہے۔ جس کے دو اُردو ترجمے ہوئے پہلا ترجمہ ملا سید محمد قادری کے طوطی نامے کا ہے جو ۱۷۶۹ء میں لکھا گیا اور دوسرا ترجمہ ابو الفضل کی تصنیف ہے۔ پھر اسی صدی کے آخر میں بھی کچھ اور کتابوں کا ذکر کرنا بھی ضرویر ہے۔ جن میں "اسرار التوحید"، "رسالہ حقائق" جو سید شاہ میر کی تصنیف ہے۔ اس کے بعد اس دور کی آخری تصنیف محمد باقر آگاہ کی ہے جو کہ تاریخی اعتبار سے جدید و قدیم طرز کی درمیانی کڑی ہے۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے اُردو میں تصانیف کا سلسلہ چل نکلا جو کہ آگے چل کر اُردو کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اور سب رس کو اُردو نثر میں افسانوی ادب کی پہلی کوشش قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس سے قبل جتنی تصانیف آئی وہ مذہبی تصانیف تھیں۔ اس لیے یہ اُردو نثر میں افسانوی ادب کی پہلی کتاب تھی۔ اس لیے اس کی تاریخی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب "روضتہ الشہدا" ۱۷۳۱ء کا ترجمہ "کربل کتھا" کے نام سے کیا۔ فضلی کی اس کتاب کے ۳۵ سال بعد ۱۷۶۴ء میں حرز اور سودا نے اپنے دیوان مرثیہ کا دیباچہ لکھا۔ ان کی نثر مسجع اور آسان تھی۔ اس کے بعد قرآن پاک کے تراجم ہوئے جن میں مولانا شاہ رفیع الدین ۱۸۰۸ء اور مولانا شاہ عبد القادر متوفی ۱۸۱۵ء کے تراجم کو اوّلیت حاصل ہے، یہ ترجمے لفظی ہیں۔ (اس میں زبان اور محاورے کا استحصال نہیں کیا گیا۔)

لیکن انھوں نے لفظاً لفظاً ترجمے کے بجائے معنی کو وضاحت سے اور مفہوم کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا حسن ماہروی نے ۱۷۹۱ء تفسیر قرآنی موسومہ حقانی کا نمونہ بھی ملتا ہے، اسی طرح اُردو تصانیف اور تراجم کا سلسلہ چل نکلا جو آگے جا کر اُردو کی ترقی میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہر حال اٹھارویں صدی میں یورپی مصنفین نے بھی اُردو ادب میں اہم کام کیے ہیں۔ اُردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ مستشرقین کی علمی خدمات کا آغاز ۱۴۹۸ء سے ہوتا ہے۔ ایسا کوئی دور نہیں جس میں انھوں نے ادب کی آب یاری کا حق ادا نہ کیا ہو بلکہ بعض اصحاب علم کے کارنامے تو تاریخ ادب میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آج بھی اُردو ادب سے وابستگی بڑی تک قائم ہے۔ زمانہ حال کے علم کے پایہ جن ڈاکٹر شمل، جان ماریک، ڈاکٹر بوزانی، وکٹر کرتان اور رالف رسل قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً اُردو زبان کے قواعد اور صرف و نحو کی تربیت کے سلسلے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص مولوی عبد الحق نے "قواعد اُردو" لکھی۔ اس کے بعد یورپ کا مصنف جان جوہتوا کیٹلر تھا اس نے ۱۷۱۵ء میں صرف و نحو ہندوستانی کے نام سے ایک گرامر لکھی جس کو لاطینی زبان میں مرتب کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کچھ رسالے بھی تصنیف کیے اس کے ساتھ اٹھارھویں صدی کے آخر میں نثری ادب کو بنیادی حیثیت مل

چکی تھی جن میں مستشرقین کا اہم کردار تھا جنہوں نے اس کی ترقی و ترویج کے لیے مختلف اقدامات کیے تاکہ ہندوستان میں نئے آنے والے انگریزوں کو اس کی زبان سمجھنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ ان میں کچھ ایسے ادارے قائم کیے گئے جن میں دہلی کالج، فورٹ ولیم کالج جارج سینٹ کالج قابل ذکر ہیں اور ڈاکٹر جان گل کرسٹ کا نام بھی یہاں ضروری ہے جنہوں نے اُردو نثر کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ انہوں نے نہ صرف جدید اصولوں کے مطابق اُردو صرف و نحو کو ترتیب دیا اور مختلف ہندوستانی مصنّفین سے آسان اور سلیس اُردو میں جو کتابیں لکھوائی اور شائع کیں یہ اُردو ادب میں ترقی کی وجہ بنی اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ تھیں جس سے ادبی دنیا کے نئے راستے کھل گئے۔ گل کرسٹ نے ہندوستانی گرامر اور ینٹل لنگوسٹ انگریزی ہندوستانی ڈکشنری جیسی قیمتی کتابیں لکھی جن سے اُن کا اُردو ادب کے ساتھ شغف کا علم ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے سب اساتذہ اور منشی جو کہ کالج میں ادبی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ سب نے اُردو کی ادبی تاریخ میں اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے۔ جس سے ان کے اُردو سے شغف کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ افسانہ، لغت، اُردو قواعد یا تذکرہ ہوں سب کے سب ہی ادبی معیار پر پورا اترتے ہیں۔ سید بخش حیدری نے ۱۸۰۰ء میں گلشن ہند کے نام سے ایک تذکرہ لکھا جو تاریخی اعتبار سے ایک اہم خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد مستشرقین میں ڈاکٹر گل کرسٹ نے اُردو قواعد پر لکھی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اُردو ادب نے ترقی کی کئی منازل طے کیں، جس میں اُردو پرانی ڈگر سے ہٹ کر جدید اُردو کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اس میں ۱۸۰۰ء میں تصنیف ہونے والی کتب اور مستشرقین کا اس زبان میں دلچسپی لینا ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ صوفیاء کرام نے بھی اُردو کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا۔ عام عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے انھوں نے سادہ اور سلیس اُردو زبان کا استعمال کیا۔ جس سے لوگوں کو آسانی سے باتیں سمجھ آنے لگ گئی۔ آغاز میں صوفیا کرام نے تصوف اور مذہبی رسائل لکھے (جن سے لوگوں تک آسانی سے) جن میں انھوں نے تصوف کی گہری باتوں کو سادگی کے ساتھ بیان کیا۔ ان میں خواجہ گیسو دراز حضرت گنج العلم کے رسائل قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ عطا حسین کی انوطرز مرصع گل کرسٹ کی قواعد اور سید حیدر بخش حیدری کی نثری تصانیف کا زبان و بیان سادہ اور قابل فہم تھا جو آنے والی نسلوں کے لیے جدید اُردو کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اسی طرح اُردو زبان و ادب کے اصل معمار ہمارے قدیم شعرا ہیں جنہوں نے زبان کو سنوارا اور داخلی مسائل کو نت نئے طریقوں سے شعر کے قالب میں ڈھال کر زندگی اور اس کے ساتھ معاشرہ کی ہر آن بدلتی ہوئی قدروں کو اجاگر کیا۔ ہمارے ادب میں ابتداً شاعری نے نثر سے کہیں زیادہ اُردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

اس طرح انیسویں صدی کے آغاز سے ہمیں سلیس اور رواں نثر کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کا اصل پس منظر اُردو کے شعری ادب اور اُردو بولنے والوں کے روزمرہ میں استعمال ہونے والی زبان میں مل جاتے ہیں۔ اس کی مثال انشاء کی دریائے لطافت ہے۔ اُردو انشا پردازی پر فارسی نثر کا بھی گہرا سایہ تھا۔ جس میں قلم صاف ستھری عبارت کلی شے کا عادی نہ تھا۔ اُردو میں فارسی زبان کے الفاظ کا استعمال ہوتا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ اُردو پر فارسی کا اثر زیادہ تھا لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اُردو نکھر نا شروع ہو گئی اس میں بے ربطی ختم ہو گئی اس کے بعد سر سید احمد خاں جو جدید نثر کے بانی قرار دیے جاتے ہیں

انہوں نے آثار الصنادید میں اس بات کو ثابت کر دیا کہ جدید نثر کس طرح سے قدیم نثر میں مختلف ہے۔ بہر حال ۱۹ صدی کے آغاز سے قبل زبان و بیان میں غیر مانوس طور پر ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی کہ جس کی وجہ سے اُردو زبان میں جدید اسلوب کے امکانات روشن ہوئے اور فورٹ ولیم کالج نے جب آسان اُردو میں کتابیں لکھنا شروع کی تو بلا کسی دشواری کے ۲۰ سال کے عرصے کم و بیش ۲۰ مصنفین کے اُردو نثر کی پچاس سے زیادہ کتابیں شائع کر دیں۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ پہلا ادبی اور علمی ادارہ تھا۔ جس نے بقول حامد حسن قادری سلیس نگاری کا مقصد متعین کر کے کام شروع کر دیا۔ اس میں افسانے، تذکرے، تواریخ، فقہ اسلام، ترجمہ انجیل اور اُردو حرف و نحو کی کتابیں اُردو میں تصنیف اور تالیف اور ترجمہ کر کے نہ صرف اُردو بلکہ اردو ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ کلکتہ سے باہر بھی اور قابل قلم حسب معمول تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ چھاپہ خانہ کے قیام نے لکھنے پڑھنے کے شوق کو اور آگے بڑھایا اور ۱۹ صدی کے ربع اوّل میں اُردو کی نثری تصانیف کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔

یہاں فورٹ ولیم کالج کا ذکر کرنا نہایت اہم ہے۔ اسی طرح دہلی کالج نے بھی نہایت اہم کام کیا۔ اس ادارے نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی جو اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

جس طرح فورٹ ولیم کالج نے اُردو زبان و ادب میں اہم کردار ادا کیا اسی طرح دہلی کالج کا نام بھی اہم ہے۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی کے مدرسہ غازی کی بنیاد رکھی جو آگے جا کر کالج کی شکل اختیار کر گیا اور مغربی خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا مرکز بن گیا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد سیاسی و سماجی تحریکات نے ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے ایک طبقے میں نئے تقاضوں کا شعور پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے عام عوام میں بھی شعور و آگہی آگئی اور انہوں نے پڑھنے لکھنے کی طرف خصوصی توجہ دینا شروع کر دی جس کا اظہار قدیم دہلی کالج اور اس کی سرگرمیوں سے ہوتا رہا۔ اسی طرح اُردو زبان و ادب میں مغربی علوم نے تراجم کے ذریعے مغربی اثرات منتقل ہوئے اور خاص طور سے یہاں کے مصنفین اپنے ملک کے سیاسی و سماجی ادراک رکھتے تھے جس کا اظہار ان کے مطبوعات کے ذریعے ہونے لگا اور یوں ہندوستانیوں کے ذہن و فکر میں دھیرے دھیرے تبدیلیوں کے آثار رونما ہونے لگے اس احساس کے ساتھ ادب میں ایک نیا نقطہ نظر پیدا ہونے لگا۔ ان تمام مصنفین کی تصنیفات میں ماضی سے وابستگی سے زیادہ مستقبل کی پذیرائی جھلک رہی تھی۔ اس بات کو صدیق رحمٰن قدوائی اس طرح بیان کرتے ہیں:

بدلتے ہوئے حالات میں سماجی تغیرات کا احساس رکھتے ہوئے جس ادارے نے اُردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم حصہ لیا وہ دہلی کالج تھا۔ یہاں نئے رجحانات مغربی فکر و فلسفہ کے زیر اثر پروان چڑھ رہے تھے۔ چنانچہ سیاسی اعتبار سے لبرازم اور سماجی اعتبار سے افادیت پسندی نے یہاں کے اساتذہ و طلبا کے طرزِ فکر پر اثر ڈالا۔ علم و فن، شعر و ادب، صنعت و حرفت، غرض کے ہر شے کے پیچھے کوئی مفید مقصد تلاش کیا جانے لگا۔

دہلی کالج جو دہلی میں نئے افکار و نظریات کا منبع و مخرج بن گیا تھا سائنسی تراجم کے ذریعے مغربی علوم کی ترویج و اشاعت کے ساتھ نئی ادبی و فنی اقدار کو جنم دے رہا تھا جس کو اس کالج کے اساتذہ نے فروغ دینے میں بیش قیمت خدمات انجام دیں۔ کالج میں تدریس کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کیں جس میں ان کے نئے فکر و مطالعہ کی پرچھائیاں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان میں جن اساتذہ نے خدمات سرانجام دیں ان میں ماسٹر رام چندر، مولوی کریم الدین، میر اشرف، ماسٹر حسینی، ماسٹر امیر علی،

مولوی احمد علی، رام کشن اور بھی اہم نام ہیں۔ ان سب کی کوششوں سے اُردو زبان کو اس عہد میں وقار ملا۔ عربی و فارسی زبانیں جن میں علوم قدیمہ کے ذخیرے محفوظ تھے ان کے الفاظ اُردو میں منتقل ہوتے رہے۔ ان زبانوں کی اصطلاحوں سے علمی اسلوب پیدا ہوا۔ انگریزی زبان کے اُن الفاظ کو یہاں قبول کیا گیا جو اُردو زبان کے مزاج سے مناسبت رکھتے تھے۔

حوالہ جات

1. مرزا خلیل احمد بیگ (مرتبہ)، اُردو زبان کی تاریخ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۵ء، ص ۲۰۴
2. حافظ محمد شیرانی، پنجاب میں اُردو، اسلام آباد: ڈائریکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۰
3. مرزا خلیل احمد بیگ، اُردو کی لسانی تشکیل، لکھنؤ: اتر پردیش، ۱۹۸۵ء، ص ۵۲
4. گوپی چند نارنگ، اُردو اور ہندی کا لسانی اشتراک، مشمولہ: زبان کی تاریخ
5. جمیل نقوی، اُردو نثر کا پہلا دور بارھویں صدی سے فورٹ ولیم کالج تک، کراچی: اُردو سندھ اکیڈمی، ص ۲

References

1. Mirza Khalil Ahmad Baig (Murataba), Urdu Zuban ki Tareekh, Ali Garh: Educational Book House, 1995, P.204
2. Hafiz Mahmood Sherani, Punjab Main Urdu, Islamabad: Director Qaumi Council Bray Faroogh Urdu, 2005, P.110
3. Mirza Khalil Ahmad Baig, Urdu ki Lasani Tashkeel, Laknow: Utar Pardesh, 1985, P.52
4. Gopi Chand Narang, Urdu Aur Hindi Ka Lasani Ishtarak, Mashmoola: Zuban ki Tareekh
5. Jameel Naqvi, Urdu Nasar Ka Pehla Daur Barhwen Sadi Se Fort William College Tak, Karachi: Urdu Sindh Academy, P.2